مثنوی

دریائے عشق

مصنفہ

میر محمد تقی میر

مرتبہ

سید انظر مسعود رضوی

میر تقی میر

دریائے عشق

مرتبہ

سید اظہر مسعود رضوی

ایم۔اے

پہلی اشاعت : ۔ ۱۹۶۸ء

قیمت : ۔ پچاس پیسے

مطبوعہ :

نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

ناشر:

کتاب نگر

دین دیال روڈ، لکھنؤ ۳

میر تقی میرؔ

مختصر حالات زندگی

میر محمد تقی میرؔ آگرہ میں ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک صوفی بزرگ تھے۔ نام محمد علی تھا اور اپنے زہد و اتقا کے باعث علی متقی کہلاتے تھے۔ سات سال کی عمر سے میر تقی اپنے والد کے ایک معتقد سید امان اللہ کی نگرانی میں رہنے لگے، جن کی تعلیمات کا ان کی شخصیت پر بہت اثر پڑا۔ یہ سلسلہ تین سال تک رہا۔ میرؔ کی عمر دس سال کی تھی کہ سید امان اللہ کا انتقال ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد انکے والد بھی راہی عدم ہوئے۔ اس کے بعد میر پریشانیوں میں گھر گئے۔ آگرہ سے تلاش معاش میں دہلی پہنچے۔ وہاں خواجہ باسط کی مدد سے صمصام الدولہ کی سرکار سے ان کے لیے ایک روپیہ روز کا وظیفہ مقرر

ہو گیا، جو ۱۷۳۹ء تک ان کو ملتا رہا۔ نادر شاہ کے ہنگامے کی وجہ سے میر آگرے واپس گئے۔ لیکن وہاں سکون میسّر نہ ہوا تو پھر دہلی چلے آئے اور اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے۔ لیکن کچھ دنوں بعد ان سے تعلقات خراب ہو گئے۔ میر شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس لیے مختلف امرا سے ان کے مراسم ہو گئے اور وہ تحصیل علم اور فکر سخن کرتے، روزگار کی سختیاں جھیلتے زندگی کے دن گزارنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی عزت اور شہرت بڑھی۔ امرا انھیں اپنے گھر لے جاتے اور ان کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ میر کی تمکنت بھی بڑھتی گئی جس کے بہت سے نفسیاتی اسباب ہیں۔

دہلی کی سیاسی حالت ان دنوں بہت خراب تھی اور اسی کی وجہ سے ہر طرف معاشی افراتفری اور انتشار تھا۔ امرا تک پریشان تھے۔ میر بھی مصائب و آلام کا شکار، قرض کے پنجے میں گرفتار، عسرت اور تنگ دستی سے گزر کرتے رہے۔ بالآخر نواب آصف الدولہ کے طلب کرنے پر ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ آئے۔ یہاں تین سو روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر ہوا، جو آخر وقت تک انھیں ملتا رہا۔ دربار میں ان کی بڑی عزت تھی اور نواب انکے کمال فن کی وجہ سے ان کے ناز اٹھاتے تھے۔ لیکن یہاں بھی وہ خوش اور مطمئن نہیں رہے۔ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کو انتقال کیا۔

تصانیف (نظم): میر کا کلیات جس میں غزلوں کے چھ دیوان، قصیدے، مثنویاں اور مختلف اصناف نظم شامل ہیں اس کے بہت سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے ہیں۔ میر نے مرثیے بھی بہت سے کہے ہیں مگر وہ صرف دو قلمی نسخوں میں موجود

ہیں جن میں سے ایک رضا لائبریری رام پور میں ہے، دوسرا پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کی ملکیت ہے۔ ان مرثیوں کو مرتب کرکے ڈاکٹر مسیح الزماں نے مراثی میر کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ مثنویات میر کے نام سے سر شاہ سلیمان نے میر کی چند مثنویاں شائع کی تھیں۔ میر کا فارسی دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں موجود ہے۔

تصانیف نثر: (فارسی) فیض میر۔ ذکر میر (خود نوشت سوانح عمری) نکات الشعرا (تذکرہ)

ذکر میر۔ اس میں میر نے اپنے اور اپنے زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب کو ایک مقدمے کے ساتھ مولوی عبدالحق نے مرتب کرکے شائع کیا تھا نثار احمد فاروقی کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

فیض میر۔ صوفی درویشوں کے چشم دید حالات چند حکایتوں کی صورت میں میر نے اپنے بڑے بیٹے میر فیض علی فیض کے لیے لکھے ہیں۔ اس رسالے سے میر کی فارسی انشا پردازی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو اولاً مقدمے اور ملخص ترجمے کے ساتھ مرتب کرکے پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب نے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن فاضل مرتب کی نظر ثانی کے بعد ایک فرہنگ کے ساتھ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

نکات الشعرا۔ یہ اردو شاعروں کا سب سے قدیم تذکرہ ہے جو مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

مثنویات میر

ڈاکٹر محی الدین زور نے میر کی مثنویوں کی تعداد چونتیس لکھی ہے[1]۔ ان میں کچھ عشقیہ مثنویاں ہیں۔ کچھ کا تعلق نواب آصف الدولہ اور ان کے دربار سے ہے اور باقی ایسی ہیں جن کا تعلق ان کی ذات یا ماحول سے ہے۔

میر واردات قلب کے گہرے نباض اور واقعات عشق کے سچے ترجمان ہیں اسی لیے وہ اردو غزل کے گل سرسبد قرار دیے جاتے ہیں۔ اس میدان میں ان کی برتری اور برتری ایسی مسلم الثبوت ہے کہ سب بڑے غزل گویوں کے یہاں اس کا اعتراف ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "میر سوز و درد سے ہمیشہ چراغ کی مانند جلتے رہے۔ اسی لیے ان کے یہاں درماندگی، گداز اور نرمی ہے۔ یہی خصوصیت کی مثنویوں میں بھی نظر آتی ہے ہم چند ممتاز اہل قلم کی رائیں اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

مولانا محمد حسین آزاد

جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے۔ اس لیے بعض لطف سے خالی نہیں۔ ان میں 'شعلۂ عشق' اور 'دریائے عشق' نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانے سے پایا۔ مگر افسوس یہ کہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں[2]"

خواجہ الطاف حسین حالی

"باوجودے کہ میر کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مطالب کو بہت

---

[1] تنقیدی مقالات [2] آب حیات ص۔

خوبی سے ادا کیا ہو جیسا کہ ایک مشاق اور ماہر استاد کر سکتا ہو۔ اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بہ مقابلہ ان کے اشعار کے جن میں پرانے محاورے یا فارسیت غالب ہو کچھ کم نہیں ہیں۔ صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کی زبان زد چلے آتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ بہت کم پایا جاتا ہو انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کیے ہیں۔ نہ ان میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہو نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہو۔ مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے پاک ہیں[1]

امداد امام اثر

آپ کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہو۔ آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں۔ کہیں آپ صحرا، جنگل، بحور، خزاں، بہار، برق، باراں، سرما، گرما، طیور وحوش، آب، سراب وغیرہ کے خوش آیند مضامین کو بیان نہیں فرماتے ہیں۔ اس پر بھی جس قدر آپ کی مثنویاں ہیں قابل توجہ ہیں۔ کس واسطے کہ روحانی اور قلبی معاملات کے بیان سے مملو ہیں۔ جتنی عاشقانہ کیفیتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں اکثر بے حیائی کی ذلتوں سے بری دکھائی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری

دیتی ہیں۔ کم تر کوئی جزو تصنیف ایسا ہو کہ تہذیب کی آنکھیں اسے دیکھ کر شرم اٹھائیں[1]"

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی:

میر کو جذبہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ یہ کیفیات فطرت کے مطالعے کے علاوہ ان کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ درد و اثر سے خالی نہیں۔ میر نے عام طور پر عشق کی عالمگیر کار فرمائیوں سے بحث کی ہے۔ ان کی مثنویاں عشق و محبت کے مرقعے ہیں۔ ان کے پلاٹ غیر اہم اور معمولی ہیں۔ اصل چیز وہ پاک اور سچا جذبہ محبت ہے جو ہر مثنوی کی فضا پر چھایا ہوا ہے[2]۔

"میر کی مثنویاں سوانحی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہیں۔ وہ گھریلو اشیا مثلاً مرغ، بلی، کتے، بکری، مکان وغیرہ پر نا قدانہ نظر ڈالتے ہیں اور ذاتی حالات اور نفسی کیفیات کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ لیکن وہ عالم خارجی کی طلسم آرائیوں اور نیرنگیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے . . . ان مثنویوں کو اگر غور سے دیکھا جائے، تو ان سے میر کے سماجی ماحول اور ان کے فطرت اور سیرت کے موثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جن میں میر کے تمام خط و خال نظر آسکتے ہیں[3]"

مثنوی دریائے عشق

اس مثنوی میں محبت کے ایک مختصر واقعے کا بیان ہے۔ ایک

---

[1] کاشف الحقائق ص ۳۲۴-۳۲۵ [2] و [3] میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۴۳۸ و ص ۴۴۵

نوجوان ایک کھڑکی میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور کھانا پینا چھوڑ کر اسی کے دروازے پر بیٹھ جاتا ہے۔ بدنامی کے اندیشے سے لڑکی کے اقربا اس کو وہاں سے ہٹانے کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو ایک تجربہ کار دایہ کے ساتھ لڑکی کو دور کسی قصبے میں رہنے کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔ نوجوان بھی سواری کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ راستے میں ایک دریا پڑتا ہے جسے پار کرنے کے لیے وہ لوگ ایک کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ دایہ اس لڑکے سے گلو خلاصی کے لیے ایک چال چلتی ہے، وہ لڑکی کی جوتی نوجوان کو دکھا کر دریا میں پھینک دیتی ہے۔ نوجوان اسے نکالنے کے لیے دریا میں کود پڑتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب دایہ لڑکی کو لے کر واپس ہوتی ہے تو لڑکی بھی عین اسی مقام پر کود کر جان دے دیتی ہے۔ جب جال ڈالا جاتا ہے تو دونوں لاشیں ہم آغوش نکلتی ہیں۔ اس طرح اس محبت کا یہ الم ناک انجام ہوتا ہے۔

میر کی تمام عشقیہ مثنویوں کا انجام موت اور ناکامی پر ہوتا ہے۔ اس میں خود ان کی ناکام محبت اور غم گین زندگی کا پرتو نظر آتا ہے۔ پہلی نظر کی محبت اور مثالی عشق کی کیفیت دریائے عشق میں بھی ہے۔ یہ بات آج کے حقیقت پسند دور میں عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن میر کے دور کی کہانیوں اور مثنویوں ہی میں نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اس عام تصور کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے لیے میر ہی کا بیان کردہ ایک واقعہ جو ان کے نگرانِ خاص میر امان اللہ کے متعلق ہے۔ یہاں لکھا جاتا ہے۔

"ایک روز میر امان اللہ جمعہ کی بازار کی سیر کو گئے۔ وہاں ان کی نظر

ایک روغن فروش لڑکے پر پڑی۔ دیکھتے ہی دل قابو سے باہر ہو گیا
اور ضبط کی طاقت جاتی رہی۔ اس محبت کے غم میں اتنا ضعف ہو گیا کہ
زمین پر پیر نہیں اتار سکتے تھے، ایک غلام کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے
کھڑے ہوتے تھے[1]

اس بنا پر اس دور کی کہانیوں میں جدید نقطہ نظر سے پلاٹ کے ساخت کی توقع نہیں کرنا چاہیئے میر کا موضوع عشق اور اس کے اثرات کا بیان ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے قصہ شروع کرنے سے پہلے عشق کے بارے میں ۳۲ اشعار میں اظہار خیال کیا ہے اور عشق و محبت کے روحانی پہلو کو مادی پہلو سے زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ یہی ان کے والد اور سید امان اللہ کی تعلیم تھی جس کو انھوں نے اپنی دوسری عشقیہ مثنویوں میں بھی بیان کیا ہے۔ اصل میں وہ عشق کی دردمندی رنج والم اور سپردگی کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے لیے واقعات کا ایک مختصر ڈھانچہ لے لیتے ہیں تاکہ اس کے سہارے اپنے ان جذبات کو پیش کر سکیں کہ عشق کا حاصل درد و غم ہیں۔ دوری اور مہجوری میں عاشق کو لذت محسوس ہوتی ہے اور مادی عشق میں اس کیفیت سے دوچار ہو کر آدمی عشق حقیقی کے اس احساس تک جا پہنچتا ہے جس میں محبوب حقیقی سے دور رہ کر وہ اس کی یاد میں محو رہتا ہے۔

دریائے عشق میں کردار نگاری بھی جدید مفہوم میں نہیں ہے۔ محبت کرنے والوں اور ایک دایہ کا ذکر اس مثنوی میں اس طرح سے ہے کہ ان کی روایتی خصوصیتیں

---

[1] میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۶۲

سامنے آتی ہیں۔ کوئی شخصی تصویر نہیں ابھرتی۔ البتہ ہیرو کے اوپر محبت میں کیا گزرتی ہے اس کا بیان انھوں نے بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ اور دراصل یہی میر کی عشقیہ مثنویوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ بقول ڈاکٹر مسیح الزماں:

"میر نے اپنی عشقیہ مثنویوں میں واقعات اور ماحول کی تصویر کشی سے زیادہ جذبات و احساسات کی ترجمانی پر نظر رکھی ہے۔ محبت میں دل جب ایک جہان بے خودی ہو جاتا ہے اور سینے میں آرزو کی مشعلیں فروزاں ہو کر زندگی کو ایک نیا رخ دیتی ہیں، اس کیفیت کی پیش کش ان کا مقصود ہے، اور اسے وہ کامیابی سے پیش کرتے ہیں[1]۔"

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میر نے دریائے عشق کا قصہ ایک غیر معلوم شاعر کی فارسی مثنوی قضا و قدر سے اخذ کیا ہے۔ اور اس قصے میں عشق کی واردات اور دایہ کے کردار کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے[2]۔ اس مضمون میں مثنوی قضا و قدر کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ شاعرانہ حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ یہ دریائے عشق کی کہانی یوں نہیں بہت مختصر ہے اس سے دایہ کا کردار نکال لیا جائے تو یہ اور بھی مختصر ہو جاتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید میر نے اس قسم کا کوئی واقعہ سنا ہو اور اس کے بعد اسے اپنے طور پر نظم کر دیا ہو۔ بہرحال اس میں میر نے واردات محبت اور کیفیات عشق پر جو لطیف اشعار کہے ہیں ان کی وجہ سے مثنوی دریائے

---

[2] بنگلور کتے رسالہ اردو، کراچی۔ اپریل ۱۹۵۰ء

عشق کو ان کی مثنویوں میں ایک اہم مقام مل گیا ہو اور میر کے خلوص و فن کاری کا یہ کمال ہو کہ اس مثنوی کے بہت سے اشعار زبان زد خلائق ہو گئے ہیں مثلاً

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں　　ایسے ڈوبے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے　　غرق دریائے عشق کیا نکلے

بے کلی جی کو تاب دیتی ہو　　طاقتِ دل جواب دیتی ہو

کام میں اپنے عشق یکا ہو　　ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہو

اس مثنوی کی سادگی، حسن بیان اور مقبولیت ہی کا اثر ہو کہ میر کے ایک کم عمر معاصر مصحفی نے اپنی مثنوی بحر المحبت لکھی جس میں اسی واقعے کو بعض جزوی اختلافات کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بحر المحبت اور دریائے عشق کو ساتھ ساتھ رکھ کر دیکھنے سے میر کے کمال فن کا قائل ہونا پڑتا ہو کہ باوجود اس کے کہ دریائے عشق کا نمونہ مصحفی کے سامنے تھا پھر بھی بحر المحبت کسی پہلو سے دریائے عشق کو نہیں پہنچتی۔ ذیل میں ان دونوں مثنویوں سے چند مقامات بالمقابل پیش کیے جاتے ہیں۔

دریائے عشق

ناگہ اک کوچہ سے گزار ہوا
آفت تازہ سے دوچار ہوا
ایک عزغے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی
بھی نہ آئی اسے خبر اس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کیساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

وقت نزدیک تھا جو آپہنچا
تا سر آب پا بہ پا پہنچا
آب کیسا کہ بحر تھا ذخار
تند و مواج و تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر
مارے چشک حباب عماں پر

بحر المحبت

کہ کسی کوچہ میں جو جا نکلا
اس کے بھی دل کا مدعا نکلا
دل تھا اس کا جو عشق آمادہ
ہو گیا اک جگہ پہ دل دادہ
یعنی اک نازنین گل رخسار
ہوئی عزغہ میں اس سے آکے دوچار
اس کی آنکھ اس پہ اسکی اس پہ پڑی
یکدگر جب بہم نگاہ لڑی
جوں یہ اس کے سما گئی جی میں
دوں کچھ اس کے بھی آگئی جی میں

تھا جہاں بحر پر محافہ دھرا
قطع رہ کر کے واں ہی آپہنچا
بحر کیسا کہ اژدہائے سیاہ
جس کی صورت سے خوف کھائے نگاہ
قطرہ اس کا ہر ایک طوفاں خیز
موج بحر بلا کی لنگر ریز

ہم کنارِ بلا ہر اک گرداب — شورِ محشر سے شورِ آب قریں
لجہ سرمایہ بخشِ تیرہ سحاب — صورت اس کی تمام چیں بہ جبیں
گزرِ موج جب نہ تب دیکھا — شکل دستِ دعا ہر ایک صدف
ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا — سر چھپائے ہوئے سپر میں کشف
کشتی اک آن کر ہوئی موجود — دیکھ ان کو عبور کا مائل
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود — کشتی اک آ لگی تہِ ساحل

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کو کر — سنتے ہی یہ سخن وہ پا بہ رکاب
گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر — گر پڑی اس جگہ یہ جوں سیماب
موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ — غوطے پانی میں متصل کھائے
لپٹی اس کو برنگِ مارِ سیاہ — حسن نے طرفہ جلوے دکھلائے
دامِ گسترده عشق تھا تہِ آب — نظر آئے بدیدۂ حُضّار
جس کے حلقے تمام تھے گرداب — گوہرِ تر سے اس کے دو رخسار
حسن موجوں میں یوں نظر آئے — دیکھ اس مہ کی روشنی تہِ آب
نورِ مہتاب جیسے لہرا دے — ہوئیں یک بار ماہیاں بے آب
تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں — دستِ رنگیں جو اس کا تھا دلکش
غیرت افزائے پنجۂ مرجاں — دی لگا اس نے اور لگی آتش
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — مار و کژدم کنارہ گیر ہوئے
سطح پانی کا آئینہ سارا — حلقۂ زلف میں اسیر ہوئے

سید اظہر مسعود رضوی

مثنوی دریائے عشق

عشق ہی تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہی چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہ نمک اس کو داغ کا پایا
گہ پتنگا چراغ کا پایا

واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ
یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہی
کہیں یہ خونچکاں حکایت ہی

تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ
ہی کسو لب یہ ناتواں اک آہ

تھا کسو کی پلک کی نمناکی
ہی کسو خاطروں کی غم ناکی

کہیں باعث ہی دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہِ جان آگہ تھا
سوزشِ سینہ ایک جا گہ تھا

کہیں عشاق کی نیاز ہوا
کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا

ہو کہیں دل جگر کی بیتابی
تھا کسو مضطرب کی بیخوابی

کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا
کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا

طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا
بے ستوں میں شرارِ تیشہ رہا

کہیں نے لبت کو لگائی آگ
کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ

کبھو افغان مرغِ گلشن تھا
کبھو قمری کا طوق گردن تھا

کسو مسلخ میں جا تنارہ ہوا
کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا سپندی کی

ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود
ایک لب پر سخن ہے خوں آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
اک سینے میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خارِ خارِ دلِ عزیزاں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے

کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا
کہیں نوحہ ہے جانِ پرغم کا

آرزو تھا امیدواروں کی
دردمندی جگر فگاروں کی

نمکِ زخمِ سینہ ریشاں ہو
نگہِ یاس ہر کیشاں ہے

حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں
شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ
ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محروم وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق یکّا ہے
ہاں یہ نیرنگ ساز پکّا ہے

جس کو ہو اس کا انتظار نصیب
ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

○

ایک جا اک جوان رعنا تھا
لالہ رخسار و سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اسکو صورت خوش سے
اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورتِ حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتے اُس کے حال کو درہم

دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ
دل سے بے اختیار کرتا آہ

سر میں تھا شور شوق دل میں تھا
عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا

کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا

اک خیاباں میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رو نکلا

نہ تسلی ہوا دلِ بیتاب
نہ تھما چشم تر سے خونِ ناب

دل کی واشد سے بے توقع ہو
ہر شجر کے تلے بہت سا رو

دیکھ گلشن کو نا امیدانہ
منھ کیا ان نے جانبِ خانہ

دل کے رکنے کا اس کو اک غم تھا
راہ چلنے میں خیال درہم تھا

ناگہ اک کوچہ سے گزر ہوا
آفت تازہ سے دو چار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی
پھر نہ آئی اسے خبر اس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

منھ جو اس کا طرف سے اسکے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا
بے طرح ہو دے گو کہ حال اس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اٹھ گئی سامنے سے یکبارہ

وہ گئی اس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پانوں واماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جاگہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطر افگار خار خار ہوئی
جاں تمنا کشِ نگار ہوئی

اس کے منہ پر پڑی جو اس کی نگاہ
ناامیدی کے ساتھ ہی سرد آہ

خو ہوئی نالہ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹ سوکھے تو خون ناب ملا
خواب و خورد دونوں کو جواب ملا

خلق اس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

جا کے اس کے قریب رو بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنا یا نہ

عاشق اس کو کسو کا جان گئے
سب بُرا اس ادا کو مان گئے

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی
ایک جا بود و باش تھی سب کی

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنِ جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں

پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بزم — سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا — کن نے مارا اسے کہاں مارا
ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار — کھینچنی ہووے خفتِ بسیار
کیجیے ایک ڈھب سے اسکو تنگ — تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمت خبط رکھیے اس کے سر — کیجیے سنگسار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار — ہو گئے سارے در پئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا — ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر — ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
کی اشارت کہ کود کانِ شہر — آئے لبریز غصہ و پر قہر
گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا — لیک روئے دل اس کا ادھر تھا
محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ — تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹھ پر حسن کا بیاں اس کا — تھا سرو سنگ آستاں اس کا
ایک دم آہ سرد بھر اٹھنا — نالہ گرم گاہ کر اٹھنا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے — اس طرف یک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ — دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ
چشمِ تر سے لہو بہا کرتا — صبح کے باد سے کہا کرتا
کاے نسیمِ سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکر جیے
جان پر آ بنی ہے تیرے لیے

جان دوں تیرے واسطے سو تو
آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور رہو چکی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

ناامیدانہ گر کر دل ہوں نگاہ
دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گھر گئے دل جو
گریہ آنسو سے ہو بجھتا ہے کبھو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
جی ہے اس سے اسیرِ آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت اک معنی نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
ایک میں اور کتنے تصدیعات

سنگ باراں سے سخت ہوں دل تنگ
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ

محرم یک نگاہ بینش نہیں
کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں

کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہو یاں سرِ راہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز

بس تغافل ہوا ترحم کر
گوشِ دل جانبِ تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ محوِ ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

ان بلاؤں پہ ان نے صبر کیا
اختیار اپنے جی پہ جبر کیا

اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا
اس کے اندوہ سے نہ منھ موڑا

اور یہ ماجرا ہوا مشہور
شور رسوائیوں کا پہونچا دور

دیکھ کر اس کو بیخور و بیخواب
جانا ہر اک نے عاشقِ بیتاب

منھ پر اس کے جو رنگ خون نہیں
عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں

ہے نگہ اس کی جس طرف مائل
اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل

جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں

عشق بے پردہ جب فسانہ ہو
مضطرب کد خدائے خانہ ہوا

گھر میں جا بہر دفع رسوائی
بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی

یاں سے یہ غیرتِ مہِ تاباں
جا کے چندے کہیں رہے پنہاں

شب محافے میں اس کو کر کے سوار
ساتھ دے ایک دایۂ عشدار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکر رفع تہمت کی

گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ
واں ہو رو پوش تا یہ غیرتِ ماہ

ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع
نورافزائے خانہ ہو جوں شمع

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

واں کے رہنے سے اسکو کام نہ تھا — وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا
جس سے جی کو کمال ہو الفت — جس سے دل کی درست ہو نسبت
جنبش اس کی پلک کو گرداں ہو — دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
واں اگر مو شکست کا ہو باب — یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار — دل سے یاں سر نکالے ہو یکبار
یار کو درد چشم اگر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے
چاک دامن ہیں واں پے زینت — یاں گریباں ہو چاک گل کی صفت
واں دہن تنگ یاں ہو دل تنگی — حسن اور عشق میں ہو یک رنگی
دست افشاں وہ پائے کوباں یہ — تھا محافے کے ساتھ گرم رہ
قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام — در پے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زباں پہ جاری — خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہمسری اس کی تھی میسر کب — ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب
شوق مفرط نے لے تھی کی طاقت — ناشکیبی نے دل سے باندھا رخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے — اڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطراب دلی نے زور کیا — ان نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا — آفت تازہ جان پر لایا
کاے جفا پیشہ و تغافل کیش — اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منہ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی
نگہ التفات ادھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں

منزلِ وصل دور ہیں گم پا
تجھکو اس مرتبے میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال
میں ستم کش ہوا کیا پامال

بستر خواب پر تجھے آرام
مجھکو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لب لعل تیرے خنداں تھے
یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

گوش نزدیک کیے ہوئے یہ سخن
تھی وہ استاد کا حیلہ و فن

پاس اس کو بلا تسلی کی
وعدۂ وصل سے تشفی کی

کاے ستم دیدۂ غم دوری
ہو چکا اب زمان مہجوری

زار نالی نہ کر شکیبا ہو
عشق کا راز تا نہ رسوا ہو

دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے
چل کوئی دم کو داد خواہش دے

سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ — قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسنِ اتفاق سے ہے — اس کی بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا — نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزم عشرت کریں گے باہم ساز — ہو جواب اپنے دوست کا دمساز
دے کر اس کو فریب ساتھ لیا — دلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ ان نے یہ ٹھانی — کیجیے اس سے خصمی جانی
یہ تو دل تفتۂ محبت تھا — سخت وارفتۂ محبت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہونچا — تا سر آب پا بپا پہونچا
آب کیسا کہ بحر تھا ذخار — تند و مواج و تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر — مارے چشمک حباب عمّاں پر
ہمکنار بلا ہر اک گرداب — لجّہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب
گز ر موت جب نہ تب دیکھا — ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود — ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ — تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینے میں جلد جا پہونچا — یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر — کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اکبار — اور بولی کہ او جگر افگار

جیف تیرے نگار کی پاپوش
موجِ دریا سے ہو وے ہم آغوش

غیرتِ عشق ہے تو لا اُس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو

اس طرف آب کے اترنا ہے
اس نواحی کی سیر کرنا ہے

پانوں اس کے جو ہیں نگار آلود
ظلم ہے ہو دیں گر غبار آلود

جس کفِ پا کو رنگ گل ہو بار
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

ان پہ نرمی میں گل سے ہون جو پرے
آبلہ چشم کو سیاہ کرے

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
مفت ناموسِ عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سن کے یہ حرف دایۂ مکار
دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کار عشق کی تہ سے
جست کی ان نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہو گئی پا میں

کھنچ گیا قعر کو یہ گوہرِ ناب
تھی کشش عشق کی مگر تہِ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے
غرقِ دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

جبکہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں
کھو گیا گوہرِ گرامیِ جاں

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
واں سے کشتی چلی برنگ باد

خار خار دلی سے فارغ ہو
لے گئی پار اس گل نو کو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشق بے دل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر
لا دے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاک خوباں بھی ان نے دی برباد

قصّہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشکِ مہ زخود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہوگیا عزق وہ فر و مایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزومند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
ساتھ اسکے گئے وے شور و فساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں نہیں بائے

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشت طبع اب تو افزوں ہو
حال جی کا مرے دگرگوں ہو

بے دماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کے وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہووے گا
آج کل میں جنون ہووے گا

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے
طاقت دل جواب دیتی ہے

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر
ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو
ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز

اب تو میں فتنے کو سلایا ہے
اس بلا کے تئیں بھٹایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
سدّ رہ کون ہے نکلنے کا

ہو محافے میں دلخوشی سے سوار
شاد شاداں کر آب سے تو گزار

دل سے اپنے پدر کے غم کم کر
مادر مہرباں کو خرّم کر

کر ملاقات ہمدموں سے تو
گرم بازی ہو محرموں سے تو

یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق
گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے
عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

جذب سے اپنے جب کرے ہے کام
عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام

صبح گاہاں وہ عزیمتِ خورشید
اس جگہ سے رواں ہوئی نومید

پہونچی نصف النہار دریا پر
روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش

تجکو آیا نظر کہاں آکر
پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جاکر

مجھ کو دیجو نشان اس جا کا
میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب
نا شناسائے موجہ و گرداب

لجہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں
گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں

ہیں میسّر کہاں یہ سیرِ عبور
اتفاقی ہیں اس طرح کے امور

مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل
لیک تہہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق
ہو یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف
یاں ہوا تھا وہ اجرائے شگرف

یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند
پھر نہ تھا کچھ سراب کی مانند

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر
گر پڑی قصد ترکِ جاں کرکر

موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ
لپٹی اس کو بہ رنگِ مارِ سیاہ

دامِ گسترده عشق تھا تہہ آب
جس کے حلقے تمام تھے گرداب

حسن موجوں میں یوں نظر آوے
نورِ مہتاب جیسے لہراوے

تھیں وہ اس کی حنائی انگشاں
غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا
سطحِ پانی کا آئینہ سارا ہا

کششِ عشق آخر اس مہ کو
لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو

کودے غواص و آشنا سارے
تا بمقدور دست و پا مارے

کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب
نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب

جا ہم آغوشِ مردہ یار ہوئی
تہہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی

پاک کی زندگی کی آلایش　　ہو کے دست و بغل کی آسایش
سر ٹپکتی جو گھر گئی دایہ　　آفت اک لے گئی نئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب　　خاک افشاں بسر و نالہ بلب
دار و دستہ تمام اس گل کا　　ترک آئین کر تجمّل کا
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں　　آتش غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر　　حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا　　آخر ان کو اسیر دام کیا
نکلے باہم و لے موئے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چپاں بہم ہویدا تھا　　مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالین　　ایک کے لب سے ایک کو تسکین
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی وار　　ہمدگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے انکا فصل　　جان دے دے ہوا ہو جنکا وصل
حیرت کار عشق سے مردم　　شکل تصویر آپ میں تھے گم

میر اب شاعری کو کر موقوف　　عشق ہی ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہی　　اس سے جو تو کہے سو آتا ہی

کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے　　کتنی طاقت تری زباں میں ہے

لب پہ اب مُہرِ خامشی بہتر
یاں سخن کی فراموشی بہتر

اردو شعر کے تذکروں میں نادر اضافہ

تذکرۂ نادر

مصنفہٗ

کلب حسین خاں نادر شاگرد ناسخ

مرتبہٗ

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

سوا پانچ سو شاعروں کے مختصر مگر نہایت ضروری حالات، ان میں سے بیشتر شاعر مصنف کے ہم عصر ہیں، اس تذکرے میں ایسے متعدد نامی شعرا کی غزلیں موجود ہیں جن کا غزلیہ کلام بہت کم یاب ہے، مثلاً ضمیر، خلیق، دبیر، انیس، مونس، سرور وغیرہ۔ اور بہت سی کام کی باتیں ایسی ملتی ہیں جو دوسرے معروف تذکرہ نویسوں سے قلم انداز ہو گئیں۔

قیمت -/۳

"اردو کے تذکروں میں ایک نادر اضافہ ہے" پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

ہفت روزہ ہماری زبان علی گڑھ

حرف غزل

زیر طبع، مصنفہ ڈاکٹر سید مسیح الزماں

اردو غزل: ہیئت و ابتدا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے غزل کے مختلف پہلو، غزل اور سیاست، دبستان لکھنؤ و دبستان دہلی۔ ان کی خصوصیات اور فرق، عہد قدیم سے عہد جدید تک کے مشہور غزل گو شعرا، حالات زندگی اور کلام پر مبسوط تبصرہ۔

قیمت ۳/۵۰

ناشر

کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۳